خواجہ محمد زکریا

پروفیسر ایمریطس،پنجاب یونیورسٹی،لاہور

فیض: بہترین ترقی پسند شاعر

Khwaja Muhammed Zakria

Professor Emerates, Punjab University, Lahore

Faiz : A Prominent Progressive Poet

Since its inception in 1936, the Progressive Movement of Literature in India attracted many enthusiastic young writers of some major Indian Languages. The movement had a charter to be followed by its members and its main points included a struggle for independence and a craving to end all kind of exploitation from the society. The movement demanded that the writers should reflect the issues on the lines of its charter. Many writers followed these directions faithfully but in their zeal, ignored the artistic qualities which are sine qua non of good literature.

This article tries to prove that Faiz, as compared to other progressive poets, does not ignore the literary and artistic qualities of poetry and for this reason he is acclaimed to be the best Urdu poet of the Progressive Movement.

اردو نظم کے ارتقا کا سلسلہ انیسویں صدی کے ربعِ چہارم سے شروع ہوا۔ لاہور میں منعقد ہونے والے ۱۸۷۴-۷۵ء کے مناظموں نے معاصر شعراء کو متوجہ کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے غزل گوئی کا رجحان نظم نگاری کی تحریک میں تبدیل ہونے لگا۔ انگریزی کے رومانی شاعروں کی نظموں کے تراجم ہوئے اور انھی کے انداز میں یا ان سے متاثر ہو کر نیچرل شاعری کی اصطلاح استعمال کیا جانے لگا۔ دریا، پہاڑ، وادیاں، میدان اور اس قبیل کے مناظر پر طبع آزمائی ہونے لگی۔ روایات، اساطیر، تاریخ، معاشرت اور سیاست جیسے موضوعات مطبوعِ طبائع بن گئے۔ بیسویں صدی کا آغاز ہوا تو یہ سلسلہ جاری رہا۔ اقبال نے جو ایک الگ دبستان کی حیثیت اختیار کر گئے تھے پہلے اپنی شاعری کو انھی مراحل سے گزارا اور پھر اس کا رخ مِلی موضوعات کی طرف موڑ دیا۔ انھوں نے موضوع و فن میں پابند نظم کو نقطۂ عروج تک پہنچایا اور پھر چند سال بعد آنے والے شعراء نے نظم کو عمودی بلندی تو نہ دی البتہ افقی پھیلاؤ میں خوب حصہ لیا۔ بیسویں صدی کے ربعِ اوّل سے رومانی رجحان صنفِ نظم میں در آیا۔ جوش، حفیظ، اختر شیرانی وغیرہ نے رومان کی متعدد جہتوں کو نظموں کا

لبادۂ رنگ رنگ پہنایا، ہیئتوں کے تجربات کیے اور ارکان کے الٹ پھیر سے نئی بحور کا لطف پیدا کیا اور اس طرح پابند نظموں کو افقی طور پر زیادہ وسعت دی۔ پھر ۱۹۳۶ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے افتتاحی اجلاس منعقدہ لکھنو نے رومانی رجحان کی بساط لپیٹنی شروع کی اور دیکھتے ہی دیکھتے ترقی پسند تحریک ہر طرف گونجنے لگی۔ چند ہی سال بعد حلقہ ارباب ذوق کا قیام عمل میں آیا اور پھر رفتہ رفتہ اس کے اثرات بھی ملک کے کئی ادبی مراکز تک جا پہنچے۔ انھی دنوں ایسے اہم نظم نگار بھی سامنے آئے جو ترقی پسند تحریک یا حلقہ ارباب ذوق میں سے کسی کے ساتھ وابستہ نہیں تھے لیکن انھوں نے نظم نگاری میں قابلِ قدر اضافے کیے، اردو میں نیم مغربی انداز کی نظمیں لکھیں جن میں ہماری کلاسیکی روایت سے استفادہ کرنے کے ساتھ ساتھ مغربی نظم کی تکنیک اور بعض جگہ اس کے مافیہ سے اثرات قبول کیے گئے تھے۔ پابند نظم سے نظمِ معریٰ اور نظمِ آزاد کے تجربات ہونے لگے، اس طرح اردو نظم بیسویں صدی کے نصف اوّل میں اتنے رنگا رنگ تجربات سے گزری کہ اس کی ثروت مندی پر خوشگوار حیرت ہوتی ہے۔

اگر چند ممتاز نظم نگاروں کے ناموں پر نظر ڈالی جائے تو اقبال بجائے خود ایک دبستان تھے۔ رومانی رجحان کے پھیلاؤ میں حصہ لینے والوں میں جوش اور حفیظ کے ساتھ اختر شیرانی کا نام رومان کے ساتھ ساتھ لازم وملزوم کی حیثیت اختیار کر گیا۔ ترقی پسند شعراء میں بے شمار نام معروف ہوئے جن میں علی سردار جعفری، مخدوم محی الدین جیسے اشتراکی ترقی پسندوں کے ساتھ ساتھ فیض، مجاز اور ساحر جیسے نظم نگار بھی نمایاں ہونے لگے جن کے ہاں ترقی پسندی سے مخصوص موضوعات کے ساتھ ساتھ فنی حسن بھی کسی نہ کسی انداز میں جھلکتا تھا۔ پھر ظہیر کاشمیری، احمد ندیم قاسمی اور قتیل شفائی وغیرہ تھے جن کے ہاں ان موضوعات کی شدت کے ساتھ ساتھ ادبی قدروں کو ساتھ لے کر چلنے کی کوشش بھی تھی۔ حلقہ ارباب ذوق سے تعلق رکھنے والوں میں میرا جی، یوسف ظفر، مختار صدیقی اور قیوم نظر وغیرہ کے تجرباتِ نظم نے بھی پڑھنے والوں کو متوجہ کرنا شروع کر دیا تھا۔ ن۔م۔راشد رومانی رجحان، ترقی پسند تحریک اور حلقہ اربابِ ذوق والوں سے جزوی مماثلت کے باوجود ایک نئی دنیا آباد کیے ہوئے تھے اور انفرادیت پسند مجید امجد بھی ناوابستہ شاعر کی حیثیت سے تواتر کے ساتھ رسائل میں چھپنے لگے تھے اگرچہ اس کے باوجود وہ ادبی حلقوں کی بہت کم توجہ حاصل کر سکے تھے لیکن بعد ازاں انھی میں سے بعض نظموں کی بہت تحسین ہوئی۔ ترقی پسندوں میں منیب الرحمٰن بھی اچھی نظمیں لکھنے کے باوجود نظر انداز ہوئے اور ابتدا میں یہی صورت اختر الایمان کے ساتھ پیش آئی۔ بہرحال بیسویں صدی کے پہلے نصف میں نظم نگاری کے کئی بڑے بڑے نام سامنے آئے اور پھر ان میں سے کئی شعراء مزید پندرہ بیس سال تک اردو شاعری کے انتہائی نمایاں لکھنے والوں کی حیثیت سے جانے گئے۔

آج اکیسویں صدی کے شروع میں پلٹ کر جب ماضی کی طرف نگاہ دوڑائی جائے تو بہت سے نام جو اپنے زمانے میں بہت بڑے تھے اب اتنے بڑے نہیں رہے اور رفتہ رفتہ ان کی طرف سے توجہ ہٹ گئی ہے۔ اقبال کے بعد فیض، ن۔م۔راشد، میرا جی اور مجید امجد چار ایسے شعراء رہ گئے ہیں جن کا ذکر زیادہ کیا جانے لگا ہے اور اگر شہرت ومقبولیت کو پیمانہ بنایا جائے تو اقبال کے بعد فیض ہی سب سے اہم شاعر مان لیے گئے ہیں اور اقبال کے بعد فیض ہی پر نقادوں نے سب سے زیادہ توجہ مبذول کی ہے۔ تنقیدی مضامین، حیات وادبی خدمات پر کتابیں اور رسائل کے نمبر جتنے فیض پر شائع ہوئے ہیں اتنے ان کے کسی ہمعصر شاعر کو نصیب نہیں ہوئے۔ ادب میں شہرت ومقبولیت کی وجوہ کا ادراک اتنا سہل نہیں ہوتا۔ شہرت کے اسباب دریافت کرنے کی کوششیں بعض اوقات تجزیات سے ماورا معلوم ہونے لگتی ہیں اور کبھی کبھی شاد عظیم آبادی کا یہ شعر تجزیوں پر بھاری نظر آنے لگتا ہے:

جو سچ پوچھو تو شاد اپنے کیے کچھ بھی نہیں ہوتا خدا کی دین ہے انسان کا مشہور ہو جانا

ادب کی دنیا میں کئی نام آپ کو ایسے دکھائی دیں گے جن کا کام وقیع ہے لیکن انھوں نے کام کی نسبت کم شہرت پائی ہے۔ ان میں خود شاد عظیم آبادی شامل ہیں اور دوسرے ان کے ہم تخلص شاد عارفی ہیں۔ علاوہ ازیں تذکرے اس قسم کے ناموں سے بھرے پڑے ہیں جن کی شاعری فن کے معیاروں کی رو سے عمدہ شاعری ہے لیکن آج ان کا نام بھی چند ماہرین کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ فیض کی شہرت کے اسباب جاننے کی کوشش کی جائے تو ان میں سب سے نمایاں صفت ترقی پسند تحریک سے ان کی وابستگی ہے۔ ترقی پسندوں میں سے کم سے کم ایک درجن شعراء نے اپنے عہد میں بہت شہرت پائی۔ آج سے نصف صدی پہلے تک مجاز کی شہرت فیض سے کم نہیں تھی۔ ساحر لدھیانوی بھی نوجوانوں کے پسندیدہ شاعر تھے۔ علی سردار جعفری، مخدوم محی الدین، جذبی، مجروح سلطان پوری، جاں نثار اختر، شکیل بدایونی، ظہیر کاشمیری، کیفی اعظمی کتنے ہی ترقی پسند شاعر تھے جو کم وبیش جانے پہچانے جاتے تھے لیکن آج ۲۰۱۱ء میں اس بات پر اتفاق رائے ہے کہ اس تحریک کے سب سے بڑے شاعر فیض ہیں۔ اس بات کو ترقی پسند ہی نہیں، دیگر ناقدین بھی تسلیم کرتے ہیں۔ فیض کی متعدد نظمیں ایسی ہیں جو خواص کی پسند سے آگے بڑھ کر عوام پسند ہو چکی ہیں۔ ان میں ایسی گھلاوٹ، ایسی فضا بندی اور اتنا حسن ہے کہ محسوس کر کے پڑھنے والا ایک بلند تر سطح سے لطف و کیف محسوس کرتا ہے جب کہ نسبتاً کمتر درجے کا قاری اس سے کسی اور سطح پر متاثر ہوتا ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ میر نے اپنے بارے میں جو کہا تھا:

شعر میرے ہیں سب خواص پسند گفتگو پر مجھے عوام سے ہے

فیض کی شاعری پر صادق آتا ہے۔

فیض نے ۱۹۳۸ء میں ایک مضمون بعنوان 'ادب کا ترقی پسند نظریہ' میں لکھا تھا:

''یہ صحیح ہے کہ ہم اگر مزدوروں میں رہیں، ان سے تعلقات رکھیں تو ہم ان کے مسائل کو بہتر سمجھ سکیں گے لیکن اگر ہمیں قوتِ احساس، قوتِ تخیل اور قوتِ اظہار میں سے تھوڑا سا حصہ ملا ہے تو ہم تھوڑی بہت کامیابی کے ساتھ یہی کام یوں بھی کر سکتے ہیں۔ اگر ترقی پسند مصنفین کی آواز مزدوروں تک نہیں پہنچتی تو نہ پہنچے۔ مجھ تک اور آپ تک تو پہنچتی ہے۔ ان کی تحریروں سے اتنا بھی ہو جائے کہ ہم اور آپ ان مسائل پر غور کرنا شروع کر دیں تو یہی غنیمت ہے۔

حیرت ہے آج فیض کی شاعری کمتر درجے کے قاری تک براہِ راست پہنچ رہی ہے۔ دراصل بعض شعراء کی شاعری پوری طرح سمجھ میں نہ آنے کے باوجود عوام تک اپنا تاثر کسی طلسمی انداز سے منتقل کر دیتی ہے۔ اقبال کی شاعری اس کی بہترین مثال ہے جو فیض کی شاعری سے کہیں زیادہ مشکل ہونے کے باوجود ایک عوامی اپیل رکھتی ہے اور یہی کیفیت فیض کی شاعری کی ہے۔ یہ کیفیت، لفظ، امیج، صوت، خیال، جذبہ وغیرہ سے مل جل کر پیدا ہوتی ہے اور اسی کیفیت نے اس شاعری کو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ زندہ سے زندہ تر بنا دیا ہے۔

نظریاتی شعراء کی مقبولیت ناوابستہ شعراء سے زیادہ ہوتی ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ اسے قارئین کے ایک بڑے حلقے کی طرف سے نظریاتی اتفاق رائے کے سبب پذیرائی خود بخود حاصل ہو جاتی ہے۔ اقبال عظیم شاعر ہیں لیکن ان کی مقبولیت میں بڑا حصہ ان کے اسلامی نظریاتی شاعر ہونے کا ہے اور فیض کی مقبولیت کا بڑا راز بھی یہی ہے کہ وہ بھی نظریاتی شاعر ہیں اور چونکہ ترقی

پسند نظریے کو ماننے والوں کی ایک خاصی بڑی تعداد موجود رہی ہے اور اب بھی موجود ہے اس لیے نظریاتی ہم آہنگی مقبولیت میں اضافے کا موجب بن گئی ہے۔

نظریاتی شاعر تو سردار جعفری اور مخدوم بھی ہیں۔ ان کی عملی جدوجہد بھی کسی دوسرے ترقی پسند سے کم نہیں۔ ترقی پسند تحریک کے دوران انھوں نے شدائد دوسروں سے زیادہ برداشت کیے ہیں لیکن آج ان کی شاعری فراموش ہو چکی ہے، مجاز کی مقبولیت اب پہلے سے بہت کم ہے۔ ساحر لدھیانوی کی طرف کسی قدر توجہ دکھائی دیتی ہے لیکن ان کی وہ شہرت نہیں رہی جو نصف صدی پہلے تھی فیض آج پہلے سے کہیں زیادہ زندہ اور توانا شاعر سمجھا جاتا ہے اور ترقی پسند تحریک سے تعلق نہ رکھنے والے بھی اسے اہم شاعر تسلیم کرنے لگے ہیں۔ اس کی وجہ اپنے معاصر ترقی پسند شعراء کے برعکس کھردری حقیقت نگاری سے گریز ہے۔

بیسویں صدی میں نظم کے رنگا رنگ تجربات نے اچھے قاری کی توجہ غزل سے زیادہ نظم کی طرف کر دی ہے اس کے باوجود غزل ایک زندہ صنف ہے اور رہے گی۔ ہمارے عہد کے ممتاز نظم نگاروں میں راشد، میرا جی، مجید امجد، اختر الایمان وغیرہ میں فیض واحد شاعر ہیں جنھیں صنفِ غزل پر بھی وہی قدرت حاصل ہے جو نظم پر ہے۔ غزلیں راشد اور اختر الایمان نے بھی لکھی ہیں لیکن خود ہی غزلوں کو اپنے مجموعوں میں شامل نہیں کیا یا شامل کر کے بعد کی اشاعتوں سے خارج کر دیا۔ میرا جی اور مجید امجد غزل میں بھی ناکام نہیں ہیں تاہم ان کی نظم نگاری کی حیثیت غزل گوئی پر فائق ہے لیکن فیض کے بارے میں یہ کہنا ممکن نہیں کہ غزل گوئی اور نظم نگاری میں سے ان کی کوئی ایک حیثیت دوسری سے کمتر ہے۔ جس شاعر کے ہاں غزل میں اس قسم کے اشعار موجود ہوں اسے لامحالہ اہم غزل گو تسلیم کرنا پڑتا ہے۔

فریبِ آرزو کی سہل انگاری نہیں جاتی
ہم اپنے دل کی دھڑکن کو تری آوازِ پا سمجھے

....

دنیا نے تیری یاد سے بیگانہ کر دیا
تجھ سے بھی دل فریب ہیں غم روزگار کے

....

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا
وہ بات ان کو بہت ناگوار گزری ہے
چمن پہ غارتِ گلچیں سے جانے کیا گزری
قفس سے آج صبا بے قرار گزری ہے

....

درِ قفس پہ اندھیرے کی مہر لگتی ہے
تو فیض دل میں ستارے اترنے لگتے ہیں

....

رنگ پیراہن کا خوشبو زلف لہرانے کا نام
موسمِ گل ہے تمھارے بام پر آنے کا نام

....

کر رہا تھا غمِ جہاں کا حساب
آج تم یاد بے حساب آئے

....

اٹھ کر تو آ گئے ہیں تری بزم سے مگر
کچھ دل ہی جانتا ہے کہ کس دل سے آئے ہیں

....

جب تجھے یاد کر لیا صبح مہک مہک اٹھی
جب ترا غم جگا لیا رات مچل مچل گئی
آخرِ شب کے ہمسفر فیض نہ جانے کیا ہوئے
رہ گئی کس جگہ صبا صبح کدھر نکل گئی

....

ہر چارہ گر کو چارہ گری سے گریز تھا
ورنہ ہمیں جو دکھ تھے بہت لا دوا نہ تھے

....

مقام فیض کوئی راہ میں جچا ہی نہیں
جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے

....

ہاں جاں کے زیاں کی ہم کو بھی تشویش ہے لیکن کیا کیجے
ہر رہ جو ادھر کو جاتی ہے مقتل سے گزر کر جاتی ہے
ہم اہلِ قفس تنہا بھی نہیں ہر روز نسیم صبح وطن
یادوں سے معطر آتی ہے اشکوں سے منور جاتی ہے

....

کہاں گئے شبِ فرقت کے جاگنے والے
ستارۂ سحری ہم کلام کب سے ہے

....

وہ بتوں نے ڈالے ہیں وسوسے کہ دلوں سے خوفِ خدا گیا
وہ پڑی ہیں روز قیامتیں کہ خیالِ روزِ جزا گیا

....

سبھی کچھ ہے تیرا دیا ہوا سبھی راحتیں سبھی کلفتیں
کبھی صحبتیں کبھی فرقتیں کبھی دوریاں کبھی قربتیں
یہ سخن جو ہم نے رقم کیے یہ ہیں سب ورق تری یاد کے
کئی لمحے صبحِ وصال کے کئی شام ہجر کی مدتیں
مری جان آج کا غم نہ کر کہ نہ جانے کاتبِ وقت نے
کسی اپنے کل میں بھی بھول کر کہیں لکھ رکھی ہوں مسرتیں

جس شاعر کے ہاں غزل کے ایسے پُر تاثیر، فصیح، روایت سے جڑے ہونے کے باوجود تر و تازہ اشعار موجود ہوں، اس کی غزل کو کسی طرح بھی کمتر درجہ نہیں دیا جا سکتا۔ اس کے باوجود فیض کی نظموں کو کئی لحاظ سے ان کی غزلوں پر فوقیت دینی پڑتی ہے۔

نظریاتی شاعر اپنے نظریے کا مربوط انداز میں اظہار صنفِ نظم ہی میں کرتا ہے اور اس سلسلے میں فیض کی حیثیت استثنائی نہیں۔ جس طرح اقبال کو کمتر درجے کا غزل گو نہیں کہہ سکتے مگر ان کے افکار کا بہتر اظہار نظموں میں ہوا ہے یہی صورت فیض کے ہاں نظر آتی ہے۔ ترقی پسند تحریک کا مقصد لوگوں میں اس بات کا شعور پیدا کرنا تھا کہ دنیا میں طبقاتی تقسیم بڑی خوفناک ہے۔ ملکوں کے ہاتھوں ملکوں کی لوٹ مار اور لوگوں کے ہاتھوں لوگوں کا استحصال ہر طرف جاری ہے۔ ہمیں استحصالی قوتوں کے طریقِ کار کو سمجھنا اور عملی جد و جہد کر کے ان کے شکنجے سے نکلنا ہے۔ ملک کے اندر جاگیردار اور سرمایہ دار طبقے نے کسان اور مزدور کو بدترین استحصال کا شکار بنا رکھا ہے۔ اربابِ اختیار بالائی طبقے سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کی وفاداری صرف اپنے طبقے سے ہے۔ بے کاری، بے روزگاری اور فاقہ کشی نے لوگوں کو جینے کے حق سے محروم کر رکھا ہے۔ موسم کے شداید، بیماریاں، سر چھپانے کے لیے چھت کا نہ ہونا، عزتِ نفس سے محرومی، تعلیم سے دوری، علاج معالجے کا میسر نہ آنا -- غرض نچلے طبقات کے لیے مسائل ہی مسائل ہیں۔ ترقی پسند تحریک ان مسائل کا شعور پیدا کر کے اور لوگوں کو بالائی طبقے کے خلاف منظّم کر کے ایک ایسے انقلاب کا راستہ ہموار کرنے کی تلقین کرتی تھی جو ان کی زندگیوں کو بہتر طریقے سے زندگی بسر کرنے کے قابل بنا سکے۔ اس تحریک کے آغاز کو اب پون صدی بیت گئی ہے۔ انجمنِ ترقی پسند مصنفین کا وجود و عدم برابر ہو چکا ہے، سوویٹ یونین اب جمہوریہ روس بن چکی ہے، چین کا اشتراکی انقلاب سرمایہ دارانہ نج کاری کی معیشت اپنا چکا ہے مگر نچلے طبقات کے مسائل جوں کے توں برقرار ہیں بلکہ تیسری دنیا میں حالات پہلے سے زیادہ گمبھیر ہو چکے ہیں۔ ہمارے وطنِ عزیز پاکستان میں طبقاتی تفاوت پہلے سے زیادہ بڑھ چکا ہے اور بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ ان حالات میں فیض کی شاعری حالات سے مطابقت رکھتی دکھائی دیتی ہے۔ ان کی بہت سی نظمیں اس طبقاتی جنگ کا نقشہ کہیں براہِ راست اور کہیں بالواسطہ طریقے سے پیش کرتی ہیں۔ جہاں اظہار براہِ راست ہے وہاں فنِ شاعری کی باریکیوں سے زیادہ تعرض نہیں کیا گیا ہے۔ لیکن بعض جگہ فنی اور جمالیاتی قدروں کو اولیت دی گئی اور لاجواب نظمیں تخلیق کی گئی ہیں لیکن نظموں کی ایک قابلِ لحاظ تعداد ایسی بھی ہے جن میں جمالیاتی اور فنی تقاضے راست اندازِ بیان سے دست و گریبان دکھائی دیتے ہیں۔ یہ نظمیں بھی نظر انداز نہیں کی جا سکتیں کیونکہ ان کے کئی حصے بے مثال شاعری کے مرقعے ہیں۔

فیض کی نظموں میں سے بعض ایسے اجزاء ذیل میں نقل کرتا ہوں جو میرے خیال میں بہترین شاعری کے نمونے ہیں:

دل کے ایواں میں لیے گل شدہ شمعوں کی قطار
نورِ خورشید سے سہمے ہوئے، اکتائے ہوئے
حسنِ محبوب کے سیّال تصور کی طرح
اپنی تاریکی کو بھینچے ہوئے، لپٹائے ہوئے

....

تشنہ افکار جو تسکین نہیں پاتے ہیں
سوختہ اشک جو آنکھوں میں نہیں آتے ہیں
اک کڑا درد کہ جو گیت میں ڈھلتا ہی نہیں
دل کے تاریک شگافوں سے نکلتا ہی نہیں

(ہم لوگ۔نقش فریادی)

تیرا سرمایہ تری آس یہی ہاتھ تو ہیں
اور کچھ بھی تو نہیں پاس یہی ہاتھ تو ہیں
تجھ کو منظور نہیں غلبۂ ظلمت لیکن
تجھ کو منظور ہے یہ ہاتھ قلم ہو جائیں!
اور مشرق کی کمیں گہ میں دھڑکتا ہوا دل
رات کی آہنی میّت کے تلے دب جائے

(سیاسی لیڈر کے نام-دستِ صبا)

یہ وہ سحر تو نہیں جس کی آرزو لے کر
چلے تھے یار کہ مل جائے گی کہیں نہ کہیں
فلک کے دشت میں تاروں کی آخری منزل
کہیں تو ہوگا شبِ سست موج کا ساحل
کہیں تو جا کے رکے گا سفینۂ غمِ دل

(صبحِ آزادی-دستِ صبا)

تنہائی میں کیا کیا نہ تجھے یاد کیا ہے
کیا کیا نہ دلِ زار نے ڈھونڈی ہیں پناہیں
آنکھوں سے لگایا ہے کبھی دستِ صبا کو
ڈالی ہیں کبھی گردنِ مہتاب میں باہیں

....

چاہا ہے اسی رنگ میں لیلائے وطن کو
تڑپا ہے اسی طور سے دل اس کی لگن میں
ڈھونڈی ہے یونہی شوق نے آسائشِ منزل
رخسار کے خم میں کبھی کاکل کی شکن میں

(دوعشق-دستِ صبا)

بجھا جو روزنِ زنداں تو دل یہ سمجھا ہے
کہ تیری مانگ ستاروں سے بھر گئی ہو گی
چمک اٹھے ہیں سلاسل تو ہم نے جانا ہے

کہ اب سحر ترے رخ پر بکھر گئی ہو گی
غرض تصورِ شام و سحر میں جیتے ہیں
گرفتِ سایۂ دیوار و در میں جیتے ہیں

(نثار میں تری گلیوں کے-دستِ صبا)

الم نصیبوں جگر فگاروں
کی صبح افلاک پر نہیں ہے
جہاں پہ ہم تم کھڑے ہیں دونوں
سحر کا روشن افق یہیں ہے
یہیں پہ غم کے شرار کھل کر
شفق کا گلزار بن گئے ہیں
یہیں پہ قاتل دکھوں کے تیشے
قطار اندر قطار کرنوں
کے آتشیں ہار بن گئے ہیں

....

یہ غم جو اس رات نے دیا ہے
یہ غم سحر کا یقیں بنا ہے
یقیں جو غم سے کریم تر ہے
سحر جو شب سے عظیم تر ہے

(ملاقات-زنداں نامہ)

پنجے میں ہتھ کڑی کی کڑی بن گئی ہے گرز
گردن کا طوق توڑ کے ڈھالی ہے میں نے ڈھال
جلتے ہیں ہر کچھار میں بھالوں کے مِرگ نین
دشمن لہو سے رات کی کالک ہوئی ہے لال

(آجاؤ افریقا-زنداں نامہ)

یہاں سے شہر کو دیکھو تو ساری خلقت میں
نہ کوئی صاحبِ تمکیں نہ کوئی والیِ ہوش
ہر ایک مردِ جواں مجرمِ رسن بہ گلو
ہر اک حسینۂ رعنا کنیزِ حلقہ بگوش

....

جو سائے دور چراغوں کے گرد لرزاں ہیں
نہ جانے محفلِ غم ہے کہ بزمِ جام و سبو
جو رنگ ہر در و دیوار پر پریشاں ہیں
یہاں سے کچھ نہیں کھلتا یہ پھول ہیں کہ لہو

(یہاں سے شہر کو دیکھو-سرِ وادیِ سینا)

آیئے عرض گزاریں کہ نگارِ ہستی
زہرِ امروز میں شیرینیِ فردا بھر دے
وہ جنھیں تاب گراں باریِ ایام نہیں
ان کی پلکوں پہ شب و روز کو ہلکا کر دے

(دعا-سرِ وادیِ سینا)

یہ فیض کی بہترین شاعری کے چند نمونے ہیں۔ یہ نہ سمجھا جائے کہ ان کی اعلیٰ شاعری انھی مثالوں تک محدود ہے۔ وقت اور جگہ کی کمی کے سبب حوالے کم دیے گئے ہیں۔ فیض جانتے ہیں کہ انقلاب جلد نہیں آئے گا۔ اس کے لیے منظّم کوششیں کرنی ہوں گی۔ قربانیاں پیش کرنی ہوں گی۔ عوام کو شعور بخشنا ہوگا۔ ایک طویل جد و جہد سے گزر کر ہی اچھی اقدار کا فروغ ہوگا۔ ابھی تو لوگوں کی بنیادی ضروریات بھی پوری نہیں ہوتیں۔ انسانوں کے لیے پیٹ کا تنور بھرنا، موسموں کے شداید کے مطابق لباس اور سکونت، بیماروں کے لیے علاج معالجہ، آ گاہی حاصل کرنے کے لیے صلاحیت کے مطابق تعلیم ان کی بنیادی ضروریات ہیں۔ فیض کی شاعری ہمیں یہ شعور بخشتی ہے۔ شعور بخشنے کے لیے غیر شاعرانہ وسائل پر تکیہ کرنے کی بجائے شاعری کی ایک خوبصورت فضا بناتی ہے جو ہمیں کھردری حقیقت نگاری سے کہیں زیادہ آ گاہی بخشتی ہے اور یہ احساس پیدا کرتی ہے کہ ہم انسانوں کے دکھوں کا مداوا کرنے کی بھرپور سعی کریں۔

چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی